پروفیسر سید وقار عظیم

# "عقل و دل" اقبالؒ کی نظر میں

اقبال ایک فلسفۂ حیات کے واضح اور اس فلسفے کے آئین و ضوابط کے مبصر اور مفسر ہیں۔ اس آئین کی فلسفیانہ اور منطقی تفسیر بھی انھوں نے اپنے شعر کے ذریعے کی ہے اور ان ضوابط کی عملی تعبیر کا وسیلہ بھی اسی شعر کو بنایا ہے۔ شعر جو ہنر و فن کی لفظی صورت گری ہے، ہیچ، ناکارہ و بے معنی ہے اگر وہ سوزِ خودی کے جوہر سے خالی ہو۔ جو ہنر (اور یہاں یہ سمجھ لیجیے کہ جو شعر) ضربِ کلیمی کے معجزے کا امانت دار نہیں، اقبال کی نظر میں وہ ہنر (یا فن) نہیں کچھ اور ہے۔ ان کی آرزومندی کی نظر اس نوائے کارگر پر ہے، جو ستاروں کو پگھلا دینے کے وصف سے متصف ہو۔ رنگ و خشت و سنگ اور چنگ و حرف و صوت کے معجزات کا وجود اس فلسفی شاعر کے نزدیک خودی کی تعمیر و نگہبانی ہے۔ اقبال تعمیر و نگہبانی کا یہ فریضہ انجام دینے اور اس منصب سے عہدہ برآ ہونے کے لیے "یک چمن گل، یک نیستان نالہ، یک خم خانہ مے" کا سرمایہ لے کر بزمِ شوق میں آتے اور موقع محل کی مناسبت اور نفسیاتی تقاضوں کی مطابقت کے لحاظ سے خطیب، واعظ، ناصح، مصلح، فلسفی اور شاعر کے انداز اور لہجے میں اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اقبال کی پوری شاعری اور خصوصاً اس دور کی شاعری جس میں ان کے افکار اور تصورات میں ایک مخصوص فلسفۂ حیات کے مختلف رخوں کا جلوہ نظر آتا ہے، خودی کے مفہوم کی مفسر اور ترجمان ہے۔ کلامِ اقبال کا یہ حصہ کبھی خطیبانہ اور ناصحانہ انداز میں، کبھی منطقی اور فلسفیانہ لہجے میں اور اکثر و بیشتر بڑے لطیف اور دل نشین شاعرانہ اسلوب میں خودی کے کسی نکتے اور خودی کی تشکیل و تعمیر کرنے والے کسی تصور یا جز کی وضاحت کرتا ہے۔ ان مختلف اجزا اور عناصر میں سے ایک، یعنی عشق ایسا ہے جس کے مفہوم کے اظہار اور ابلاغ میں اقبال کے سلے جلے حکیمانہ اور شاعرانہ مزاج کو بے حد دخل ہے۔ عشق کو اقبال زندگی کا زبردست محرکِ عمل کہتے ہیں۔ اسی محرک کی مدد سے انسان فطرت کی تسخیر کرتا ہے۔ انسانی وجود کے صحیح اور مکمل مفہوم کا ادراک عشق کی رہنمائی میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف مادی زندگی کی ضمانت ہے بلکہ حیات بعد ممات بھی اسی کی بدولت ممکن ہوتی ہے۔ عشق کے یہ معنی سمجھاتے ہوئے اقبال نے عقل کے معنی بھی سمجھائے ہیں اور انسانی

زندگی میں اس کی اہمیت کے اعتراف کے باوجود اسے عشق کے مقابلے میں ایک کمتر درجے کی چیز بنایا ہے اور یہ بات کہنے کے لیے بے شمار اسلوب اختیار کیے ہیں۔ یہ تقابل جن مختلف صورتوں میں پڑھنے والے کے سامنے آتا ہے، اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

در بود و نبودِ من اندیشہ گماں ہا داشت
از عشق ہویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من

گویا جس انسانی زندگی کی حقیقت کا ادراک اندیشے یا عقل کے ذریعے ممکن نہ ہوا، اس کے معنی عشق نے بتائے۔ یا یوں کہ جس وجود کے ہست و بود یا بقا و فنا کے متعلق عقل کے دل میں طرح طرح کے وسوسے تھے، اسے عشق کی بدولت بقائے دوام حاصل ہوئی۔ اب کچھ شعر اور سن لیجیے:

خرد سے راہرو روشن بصر ہے — خرد کیا ہے؟ چراغِ رہگزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا — چراغِ رہگزر کو کیا خبر ہے

---

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

---

یا پھر عقل اور عشق کا فرق ان مصرعوں میں دیکھیے:

علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات

---

علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

---

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

اقبال نے عقل اور عشق کا فرق بیان کرنے کے جو مختلف انداز اختیار کیے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عقل اور عشق کی باہمی گفتگو سے ان کی امتیازی خصوصیات نمایاں کرتے ہیں اور یہ بات

پڑھنے اور سننے والے پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ عقل کے مقابلے میں عشق کے مرتبے اور مقام کا تعین کرے، لیکن مکالمے کا انداز اس طرح کا ہوتا ہے کہ قاری یا سامع بھی اقبال کا ہم خیال بن کر عشق کی بدیہی برتری کا قائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کا ایک مکالمہ پیامِ مشرق میں ہے۔ علم (جو عقل کا نمائندہ ہے) کہتا ہے:

نگاہم راز دارِ ہفت و چار است گرفتار کمندم روزگار است
جہاں بینم بایں سو باز کردند مرا با آں سوئے گردوں چہ کار است
چکد اے نغمہ از سازے کہ دارم
بہ بازار افگنم رازے کہ دارم

اب عشق کا جواب ملاحظہ کیجیے:

ز افسونِ تو دریا شعلہ زار است ہوا آتش گزار و زہر دار است
چو با من یار بودی، نور بودی بریدی از من و نورِ تو نار است
بخلوت خانۂ لاہوت زادی
ولیکن در نخِ شیطاں فتادی
بیا ایں خاکداں را گلستاں ساز جہانِ پیر را دیگر جواں ساز
بیا یک ذرہ از دردِ دلم گیر تہ گردوں بہشتِ جاوداں ساز
ز روزِ آفرینش ہمدمِ استیم
ہماں یک نغمہ را زیر و بم استیم

اس مکالمے کے دونوں کرداروں کی زبان سے نکلی ہوئی باتیں ایک طرف تو عقل اور عشق کی صلاحیتوں کے حدود متعین کرتی ہیں اور دوسری طرف ان دونوں کرداروں کے مزاج پر روشنی ڈالتی ہیں۔ علم (عقل) کو اپنی صلاحیتوں پر ناز بلکہ غرور ہے، جس نے اس کے لہجے میں خود پسندی کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ عشق کا لہجہ اس کے برخلاف سنجیدہ اور متانت آمیز ہے اور یہ اس کی بزرگی اور وقار کی علامت ہے۔ علم اور عشق (یا عقل اور عشق) کی اس گفتگو کو اپنے سامنے رکھیے اور بانگِ درا کے پہلے دور کی ایک سیدھی سادی نظم "عقل و دل" پر نظر ڈالیے۔ جس طرح پیامِ مشرق والی نظم میں علم نے عقل کی نمائندگی کی ہے، بانگِ درا والی نظم میں دل عشق کا ترجمان ہے۔ عقل و دل اس لحاظ سے "پیامِ مشرق" کی نظم (محاورۂ علم و عشق) سے مختلف

ہے کہ اس میں علم اور عشق دونوں اپنی اپنی بات اس طرح کرتے ہیں کہ شاعر ان کے درمیان نہیں آتا۔ نہ صرف یہ بلکہ علم اپنی بات یوں شروع کرتا ہے جیسے وہ ہوا سے باتیں کر رہا ہے، کسی سے مخاطب نہیں۔ عشق نے علم کی خودستائی کے جواب میں جو کچھ کہا ہے اس میں وہ علم سے مخاطب تو ضرور ہے لیکن اس کا انداز کسی روٹھے ہوئے شخص کا سا ہے۔ اس کی گفتگو میں بھی قرب، نزدیکی یا یگانگت کے بجائے ایک طرح کا بُعد، دُوری، غیریت اور بے گانگی ہے اور اس لیے اس کے باوجود کہ علم اور عشق دونوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں بڑی معنوی گہرائی ہے، لیکن دل میں اُتر جانے کی کیفیت ذرا بھی نہیں۔ اس کے برخلاف عقل و دل میں وہ سب باتیں ہیں جو دل کو اپنی طرف کھینچتی اور بالآخر دل میں گھر کرتی ہیں۔ اس نظم کا سارا اثر ایک دل نشین کہانی کا سا ہے، اس لیے کہ کہانی جن دو کرداروں کی ہے، وہ اپنی بات اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی ذات مجسّم ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ان کی شخصیتوں میں جو انفرادیت ہے، اس کا نقش ان کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ سے ابھرتا اور کہانی کے خاتمے تک ایک مستقل صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کہانی کو ایک طرف تو دو کرداروں کی صاف، سچی اور بے لوث باتوں نے اچھی کہانی بنایا ہے اور دوسری طرف خود کہانی کہنے والے کی دخل اندازی نے اس میں صداقت کا وہ رنگ بھرا ہے جو کہانی کے دل نشین ہونے کی لازمی شرط ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو کرداروں کی جو کہانی سن رہے ہیں، وہ کسی تیسرے شخص کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ یوں دو کرداروں کی کہانی ایک تیسرے کردار کی آپ بیتی بن گئی ہے، ایسی آپ بیتی جو کسی تکلّف اور تصنّع کے بغیر سنائی گئی ہے۔ اور جب کہانی کہنے کے انداز میں تکلّف اور تصنّع نہ ہو تو کہانی سننے والا کہانی کہنے والے کے قریب آجاتا ہے اور کہانی کی رفتار کے ساتھ قُرب کا یہ احساس بڑھتا رہتا ہے —— اس تمہید کے بعد اب سنیے عقل و دل کی کہانی:

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا        بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر، گزر فلک پہ مرا        دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا        مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسّر کتابِ ہستی کی        مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو، لیکن        غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں

کہانی بغیر کسی تمہید کے اسی روایتی بیانیہ انداز میں شروع ہوتی ہے، جو لقمان اور سعدی نے اپنی حکایتوں میں اختیار کیا اور جسے ہر دَور میں اچھی کہانی کا معیار سمجھا گیا۔ یہ سیدھا سادا بیانیہ انداز پہلے ہی جملے سے ایک

ایسی فضا کی تخلیق کرتا ہے، جس میں کہانی کہنے والا اور کہانی سننے والا دونوں ایک دوسرے کے سامنے آجاتے ہیں۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ اور ان میں غیر ارادی طور پر ذہنی مفاہمت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ کہانی کہنے والا جب یہ کہتا ہے کہ ایک دن عقل نے دل سے یہ کہا، تو ایک زود اثر برقی رو کی طرح تصورات کی کئی لہریں سننے والے کے ذہن میں دوڑ جاتی ہیں۔ اس کا ذہن چند لفظوں کی مدد سے ایک فضا تعمیر کرتا ہے، جس میں تین کردار سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ عقل کچھ کہہ رہی ہے، دل کچھ سن رہا ہے اور ایک غیر جانبدار سامع ان دونوں کرداروں کے عمل اور ردِّ عمل کو ایک رشتے میں جوڑ رہا ہے۔ کہنے اور سننے کے متوازی عمل اور ردِّ عمل سے جو فضا بنتی ہے اس میں "ایک دن" کی ترکیب ایک زمانی اور بالواسطہ ایک مکانی ماحول کی تشکیل کا کام کرتی ہے اور ساتھ ہی "یہ" ایک ایسا اشاریہ بن جاتا ہے جس میں نظر اور ذہن کو کچھ تصویریں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان تصویروں کے نقش مبہم اور غیر واضح ہوتے ہیں، اس لیے ذہن فوراً یہ سوال کرتا ہے کہ "کیا کہا؟"۔ "یہ" کا لفظ بڑی خاموشی سے اپنا کام کر کے رخصت ہو جاتا ہے اور وہ کام سوالوں کے اس سلسلے کی تخلیق ہے جن کے جواب کی جستجو میں کہانی سننے والا ہمیشہ اس کھلے ہوئے دروازے کی طرف لپکتا ہے جس میں قدم رکھ کر اسے ایک ان دیکھی دنیا کے نظارے کا یقین ہوتا ہے۔ نئی اور ان دیکھی دنیاؤں کے نظارے کا یہی شوق سننے والے کے سفر کی مہمیز ہے۔ کہانی کہنے والے کا کمال یہ ہے کہ اس جذبۂ شوق کو ابھار کر فوراً اس کی تسکین کا سامان مہیا کرے، قبل اس کے کہ یہ شوق بے چینی اور اضطراب کی صورت اختیار کرے۔ کہانی کے ابتدائی مرحلے اور تمہیدی منزل میں جس طرح سوال کا پیدا کرنا اچھی قصہ گوئی کی شرط لازم ہے، اسی طرح اس سوال کا فوری جواب مہیا کرنا بھی اس فن کا ابتدائی اور بنیادی لازمہ ہے۔ اقبال نے بغیر کسی تاخیر کے دوسرے مصرعے میں یہ لازمی شرط پوری کی ہے اور "یہ کہا" کے فوراً بعد درِ دل پر "کیا کہا؟" نے جو دستک دی تھی، فوراً اس کا جواب دیا ہے: بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں۔ لیکن اس جواب میں سے فوراً ایک سوال صادر ہوتا ہے۔ مانا کہ عقل بھولے بھٹکے کی رہنما ہے، لیکن اس رہنمائی کا انداز کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں وہ اگلا شعر پڑھتا ہے:

ہوں زمیں پر، گزر فلک پہ مرا　　　دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں

جواب میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے سوال کا جواب تو نہیں لیکن ایک دعویٰ اور ایک للکار ہے، دعویٰ پہلے مصرعے میں "ہوں زمیں پر، گزر فلک پہ مرا" اور للکار دوسرے میں "دیکھ تو کس قدر

رسا ہوں میں"۔ سننے والے کے لیے دعوے میں بھی دلچسپی کا سامان موجود ہے، لیکن زیادہ دلچسپی دوسرے مصرعے کی للکار میں ہے، جس میں کہانی سننے والے کو "تصادم" کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ تصادم اچھی کہانی کی دوسری لازمی شرط ہے کہ کہانی جتنی مختصر ہو، اس شرط کو اتنی ہی جلدی پورا ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ بات یہاں ہوئی اور عین اس وقت ہوئی جب اسے ہونا چاہیے تھا۔ سننے والے کا شوق اور بڑھا اور اس نے تیسرا شعر پڑھا:

کام دنیا میں رہبری ہے مرا  مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں

رہنمائی کے دعوے نے زیادہ واضح اور زیادہ پُرزور صورت اختیار کی ـــــ مثلِ خضر خجستہ پا ہوں میں، دعویٰ آسان لفظوں کی جگہ پُرشکوہ لفظوں میں کیا گیا اور یوں للکار کے اس تصور کو جس کا اظہار دوسرے شعر میں ہوا تھا اور زیادہ تیزی ملی۔ لہجے کی اس تیزی میں بھی کہانی سننے والے کے لیے آگے بڑھنے کی دعوت موجود ہے۔ وہ اس دعوت پر لبیک کہتا اور یہ شعر پڑھتا ہے:

ہوں مفسر کتابِ ہستی کی  مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں

یہاں لفظوں کا شکوہ بھی بڑھا ہے اور دعوے کی لَے بھی تیز ہوئی ہے اور اظہارِ خیال میں استعاروں سے مدد لی گئی ہے۔ پڑھنے والے کے سامنے بہ یک وقت کئی سوال آ گئے ـــــ عقل بھولے بھٹکے کی رہنما ہے، کس طرح؟ عقل زمین پر ہے، لیکن اس کا گزر فلک پر ہے ـــــ اس کے کیا معنی؟ عقل خضرِ خجستہ پا کی ہم سری کی دعویدار ہے۔ اس دعوئی میں کس حد تک صداقت ہے؟ عقل کتابِ ہستی کی مفسر اور شانِ کبریا کی مظہر ہے ـــــ کتابِ ہستی اور شانِ کبریا سے کیا مراد ہے؟ سوالوں کی اس یورش سے گھبرا کر وہ جوابوں کی تلاش میں اگلے شعر کی طرف رخ کرتا ہے:

بوند اک خون کی ہے تو، لیکن  غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں

لیکن یہ شعر تو اس کے سوالوں کا جواب اور اس کی الجھنوں کا مداوا نہیں۔ یہاں تو دعوے میں غرور کا رنگ شامل ہو گیا ہے اور للکار نے اپنی ستائش کی خاطر دوسرے کی تحقیر و تذلیل کو اپنا شیوہ بنایا ہے۔ صورتِ حال اب محض نفسیاتی تصادم کی نہیں رہی۔ اس کا انداز کھلم کھلا اشتعال انگیز ہے، اور کہانی پڑھنے والے کے لیے سخت پُرتشویش۔ اس کے دل میں اب تک سوالوں کا جو ہجوم تھا، ان میں ایک سوال کا اضافہ ہو گیا اور یہ سوال سب سوالوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھا

—— ارے اب کیا ہوگا؟ اوراس سوال میں کئی کئی چھوٹے چھوٹے سوال چھپے ہوئے ہیں، یہ اشتعال آخر کیا صورت اختیار کرے گا؟ عقل نے دل کی جو توہین کی ہے، اس سے دل کیا اثر لے گا؟ وہ کیا جواب دے گا؟ چنانچہ وہ کھلے ہوئے تصادم کا تماشائی بن جاتا ہے اور فوراً اگلا شعر پڑھتا ہے۔

دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے      پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں

سارے وسوسے، سارے اندیشے دور ہو جاتے ہیں۔ تحقیر آمیز اور اشتعال انگیز للکار کے باوجود تصادم کا خطرہ ٹل گیا۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔ حیرت اور استعجاب کے اس عالم میں قاری کے ذہن میں سوال اٹھتا ہے۔ خطرہ کیسے ٹل گیا؟ جواب ملتا ہے "دل کی دانش مندی سے" اور یہ دانش مندی اور اس دانش مندی کی بدولت اختیار کیا ہوا نرم لہجہ دل کی شخصیت کی بزرگی کا مظہر ہے۔ دل اس کے لیے محترم بن جاتا ہے اور احترام کے اسی جذبے کے تحت وہ دل کی باتیں سننے کے لیے ہمہ تن گوش بن جاتا ہے۔ دل نے بڑی نرمی سے جب یہ کہا کہ "پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں" تو قاری کو یہ احساس بھی ہوا کہ اس نرم لہجے میں ایک عظمت ہے۔ ایک وقار ہے اور ایک وقیع اظہار نفس ہے، اور اس لیے وہ اگلے شعروں کی طرف اس توقع کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے احساس کی صداقت کا امتحان مقصود ہے، اور اس کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہیں کہ پہلا ہی شعر اس کے احساس پر صداقت کی مہر ثبت کرتا ہے اور اگلا شعر، اس سے اگلا شعر اور پھر اس سے اگلا شعر، ان سے صداقت کا نقش مستحکم اور مستحکم تر ہوتا چلا جاتا ہے:

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے      اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے      اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے      تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی      اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

اور پھر یہ دھیمی لے آہستہ آہستہ تیز اور زیادہ تیز ہوتی ہے:

شمع تو محفل صداقت کی      حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا      طائر سدرہ آشنا ہوں میں

اور بالآخر ایک پُر وقار اور مسکت ڈرامائی اعلان پر ختم ہوتی ہے:

کس بلندی پہ ہے مقام مرا　　عرش رب جلیل کا ہوں میں

نظم کا یہ ٹھیرا ہوا، متین ڈرامائی انجام قاری کے لیے حد درجہ سکون بخش ہے۔ چند شعروں میں بیان کی ہوئی اس چھوٹی سی کہانی میں اس کا تعارف دو کرداروں سے ہوا۔ پہلے کردار نے اپنے متعلق اپنی زبان سے جو جو باتیں کہیں، ان سے اس کا دل کئی سوالوں کی آماجگاہ بنا، لیکن اس انکشاف نے کہ یہ پہلا کردار غرور کے نشے میں چور ہے اور اس غرور کے عالم میں خود ستائی پر اکتفا نہ کرکے ایسی دریدہ دہنی کا مرتکب ہو رہا ہے، جس سے کسی کی تحقیر بھی ہو اور دل بھی دکھے تو وہ اس سے بددل ہو جاتا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ جو کچھ اس کردار نے کیا ہے، اسے اس کی سزا ملے، اسی لیے جب دوسرا کردار اس کے اوصاف کا اعتراف کرتے ہوئے بھی انکسار کے لہجے میں اپنے اوصاف بیان کرتا ہے تو قاری کے احساسِ انتقام کو تسکین ملتی ہے اور جب بات ساری کی ساری ختم ہو چکتی ہے تو یہ احساس اسے مطمئن اور خوش کرتا ہے کہ لفظوں کے اس تصادم اور پیکار میں جیت اس کی ہوئی جو معزز اور محترم ہے، لیکن اس معزز اور محترم کردار کی فتح کے تصور سے بھی زیادہ مسرت بخش یہ احساس ہے کہ کمتر درجے کے کردار کو ایسی شکست ہوئی کہ وہ واضح طور پر بے حقیقت اور بے حیثیت نظر آنے لگا۔

'عقل و دل' کو اس نظر سے دیکھیے کہ وہ کس حد تک اقبال کے تصور عقل و عشق کی وضاحت کرتے ہیں اور کس حد تک اس نظم کے ذریعے اقبال عقل و عشق کے فلسفیانہ امتیاز کو نمایاں کر سکے ہیں تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اقبال نے عقل و عشق کے متعلق اس چھوٹی سی نظم میں وہ سب باتیں بیان کر دی ہیں جو وہ اپنے فارسی اور اردو کے متفرق اشعار، غزلوں اور نظموں میں طرح طرح بیان کرتے رہے ہیں۔ فنی نقطۂ نظر سے اس نظم کا تجزیہ کیا جائے تو اقبال کے اسلوب اظہار کی مخصوص صفتیں سامنے آتی ہیں۔

پہلی بات تو یہی کہ نظم کہانی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اقبال کا کردار اس چھوٹی سی فلسفیانہ کہانی میں کہانی سنانے والے کا ہے اور اس کردار یا منصب کے تقاضے انھوں نے بڑی خوبی اور بڑی چابک دستی سے پورے کیے ہیں۔ اقبال کا مقصد فلسفیانہ تصورات کا تجزیہ کرنا ہے، لیکن یہ تجزیہ کرنے کے لیے انھوں نے اپنے اظہار کو کہانی کی شکل دی ہے اور وہ فلسفیانہ تصورات کی تجسیم کرکے انھیں اس کہانی کے بولتے چالتے کردار بنایا ہے اور ان کے منہ سے ان اوصاف کا بیان کرایا ہے

جن سے ان دونوں کرداروں کی تصوراتی شخصیت اور ذات کی تشکیل ہوئی ہے۔ دونوں کردار خود اپنی اپنی ذات کا تجزیہ کرتے اور بتاتے ہیں کہ ہم کیا ہیں، اور ان کی بتائی ہوئی باتوں سے ہمارا ذہن ان کی شخصیت کی وحدت اور انفرادیت کا ادراک کرتا ہے۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے دونوں کرداروں کو بات کرنے کا ایسا انداز اور لہجہ دیا ہے کہ ہم ان کی بتائی ہوئی باتوں سے قطع نظر ان کے لہجوں سے ان کی شخصیتوں کے مدارج کا تعین کرتے ہیں اور بالآخر ایک کی پستی اور دوسرے کی بلندی، ایک کی کمتری اور دوسرے کی برتری کا نقش دلوں میں جاگزیں ہوتا ہے۔ ایک ہماری نظروں میں ذلیل ٹھیرتا ہے اور دوسرا عزیز ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے۔ کہانی آغاز، الجھاؤ اور تذبذب کے مرحلوں سے گزرتی ہوئی ایک قابل قبول انجام تک پہنچتی ہے۔ اس کا اثر آہستہ آہستہ دلوں میں جگہ کرتا اور بالکل ایک گہرے اور پرمعنی تاثر کی صورت میں دل نشین ہوتا ہے۔ نظم کا زور آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور اس وقت ذہن کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جب دل اپنے اور عقل کے اوصاف کو بار بار ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ کر دونوں کے فرق کو واضح کرتا جاتا ہے۔ نظم کے اس حصے میں جو اس مصرعے سے شروع ہوتا ہے "راز ہستی کو تو سمجھتی ہے" کئی باتیں ہیں۔ ان سب سوالوں کا جواب جو عقل کی گفتگو کے دوران میں پیدا ہوئے تھے، ان اوصاف کا بڑا نازک اور لطیف فرق جس کی بنا پر عقل کو کمتری اور دل کو برتری کا مقام ملا ہے اور سب سے بڑھ کر لفظوں کے انتخاب کی جچی تلی موزونیت، ان کا باہمی دروبست، ان کی برابر بدلتی ہوئی رفتار کا تسلسل اور آہنگ، رفتار کے تسلسل سے پیدا ہونے والی اندرونی موسیقی، دل کے کردار اور شخصیت کی متانت اور بردباری کے اعتبار سے لفظوں کی روانی میں خوش گوار ٹھیراؤ، ہر شعر کی ردیف میں تعرّزِ نفس کے وجود کا اعلان اور اس اعلان کی پیہم ورشک نظم کے وہ فنی وسیلے ہیں جن کی مدد سے اقبال نے اس سیدھی سادی نظم کو حسن بیان کا اعجاز بنانے میں مدد لی ہے۔ کہانی کے انداز میں لکھی ہوئی یہ چھوٹی سی نظم اسی سہل ممتنع کا نمونہ ہے جس کی آخری شکل اقبال کا ساقی نامہ ہے۔